جمہوریت اور اسلام: ایک مطالعہ[1]

اسلام کا نظام سیاست وحکومت کیا ہے؟ جمہوریت کا اسلام سے کیا رشتہ ہے؟ خلافت وجمہوریت میں کیا فرق ہے؟ دین اسلام اپنے ماننے والوں سے کسی خاص نظام حکومت کا تقاضا کرتا ہے یا نہیں؟ اگر دینِ اسلام کسی خاص نظام حکومت کا متقاضی ہے تو اس نظام کے بنیادی خد وخال کیا ہیں؟

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر لکھتے لکھتے پوری ایک صدی گزرنے کو ہے جس میں موضوع سے متعلق تقریباً ہر ہر گوشہ پر کافی کچھ لکھا گیا، اس پورے عرصہ میں اس مسئلہ پر اس قدر کتابیں اور مضامین لکھے گئے جن کو اگر جمع کیا جائے تو پوری ایک وسیع لائبریری بن جاتی ہے، اس لئے اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت ہے نہ موقع، تاہم حال ہی میں موضوع سے متعلق کچھ عناصر سامنے آئیں جن میں سے "اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان" کے نام سے محترم جناب محمد اسرار مدنی صاحب کی ایک کتاب بھی ہے جو ابھی کچھ دنوں پہلے منظر عام پر آگئی، اس کتاب میں مجموعی طور پر جمہوریت اور اسلام کے درمیان رشتہ جوڑنے کی پوری کوشش کی گئی ہے جمہوریت کی متعدد خوبیاں دکھائی گئی، اس پر متعدد دلائل ذکر کئے گئے اور اتنی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جس سے قاری یہ تاثر لیتا ہے کہ جمہوریت اسلام ہی کا ایک نظام حکومت ہے، جمہوریت کے علاوہ دین اسلام کا الگ کوئی قابلِ عمل نظام حکومت نہیں ہے۔

چنانچہ "جمہوریت کا اسلامی تصور" کے عنوان کے تحت فاضل مؤلف تحریر فرماتے ہیں:

"جمہوریت کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ عوام کے اجتماعی معاملات کو چلانے کے لئے عوام کی اکثریت کی رائے پر عمل کیا جائے، یہ نہ صرف انتہائی فطری اور واحد قابل عمل طریقہ ہے بلکہ دین کے تقاضوں کے بھی عین مطابق ہے، قرآن کریم کا حکم" وامرہم شوریٰ بینہم "اسی کا بیان ہے۔ اس حکم کا تقاضا محض یہ نہیں ہے کہ ان سے رسمی طور پر مشورہ کر لیا جائے بلکہ ان کے مشورہ کے مطابق ہی فیصلہ کیا جائے اور یہ مشورہ بھی کسی خاص طبقہ یا گروہ تک محدود نہ ہو بلکہ تمام لوگوں کو مشورے / رائے کا یکساں حق دیا جائے، اسی کا نام جمہوریت ہے۔"

اس کے کچھ سطر بعد لکھتے ہیں:

"جمہوریت کا متبادل صرف اور صرف آمریت ہے"

یوں تو پوری کتاب اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر ہر باب کو بحث وتحقیق کا موضوع بنا کر اس پر مستقل کلام کیا جائے، لیکن فی الحال مختلف عناصر کی وجہ سے ایسا کرنا مشکل ہے، یہاں صرف خلافت وجمہوریت کی حد تک چند ایک نظریات پر کلام کرنا ضروری معلوم ہوا، آسانی پیدا کرنے کے لئے اس بحث کو مندرجہ ذیل ترتیب دیکر اختصار کے ساتھ بیان کرنا مفید معلوم ہوتا ہے:

الف: اسلام کا کوئی نظامِ حکومت ہے یا نہیں؟

ب: اسلام کے نظمِ حکومت اور جمہوریت میں کیا بنیادی فرق ہے؟

ج: متعلقہ شبہات کا جائزہ۔

اسلام کا نظمِ حکومت

دینِ اسلام ایک کامل ضابطہ حیات ہے اس میں انسانی زندگی کے تمام تر مراحل کے متعلق کچھ احکام دیئے گئے ہیں، حیات انسانی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس میں وہ شرعی احکام سے آزاد وبالاتر ہو بلکہ مسلمان اپنے دین وایمان کی رو سے تمام شرعی احکام کا مکلف ہے، جس طرح انفرادی زندگی کے متعلق یہ تصور کیا جاتا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر اس کی طرف کچھ شرعی احکام متوجہ ہوتے ہیں یوں ہی اجتماعی زندگی کے متعلق بھی شریعتِ اسلامیہ نے کچھ ہدایات وتعلیمات دی ہے جن کی پابندی کرتے رہنا ضروری ہے، سیاست وحکومت بھی اجتماعی زندگی ہی کا ایک لازمی اور

---

[1] یہ مضمون پہلے مجلہ صفدر لاہور کے شمارہ رمضان، شوال ۱۴۴۱ھ / مئی جون ۲۰۲۰ میں شائع ہو چکا ہے

بنیادی حصہ ہے اس لئے یہاں بھی مسلمان آزاد نہیں ہیں کہ چاہے حکومت قائم کریں یا نہیں؟ اور حکومت قائم کرنے کی صورت میں خواہ کوئی بھی طرزِ حکومت قائم کریں؟

بلکہ اس میدان میں بھی شریعتِ اسلامیہ نے مسلمانوں کو کچھ احکام وہدایات دیے ہیں جن کی پابندی کرنے کا ان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، یہ درست ہے کہ قرآن وسنت نے نام لے کر کسی خاص نظم حکومت قائم کرنے کو متعین طور پر فرض قرار نہیں دیا بلکہ مجموعی طور پر یہ بات امت کے صوابدید پر چھوڑ رکھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی جو کچھ ذمہ داریاں اور اغراض ومقاصد بتلائی گئی ہیں، اس سے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم کی جاسکتی ہے کہ نظام حکومت کے متعلق اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اور وہ اپنے ماننے والوں سے کس نظامِ حکومت کے قیام کا تقاضا کرتا ہے؟

سورۃ حج میں ہے:

{ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ } [الحج: ٤١]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی نظر میں بادشاہت وحکومت بذات خود مقصود نہیں ہے بلکہ اس کا مقصود یہی ہے کہ:

۱۔ اربابِ حکومت اقامتِ صلوۃ کا اہتمام کریں۔

۲۔ نظامِ زکوۃ کی پابندی کریں۔

۳۔ امر بالمعروف کریں۔

۴۔ نہی عن المنکر کریں۔

"معروف" کے عموم میں تمام نیکیاں داخل ہیں جس میں توحید سے لے مندوبات ومستحبات شامل ہیں، یوں ہی "منکر" گناہ اور نافرمانی کو کہا جاتا ہے جس کے ضمن میں ادنیٰ نافرمانی یعنی مثلاً مکروہات سے لیکر کفر وشرک تک کی تمام نافرمانیاں اور سارے کبیرہ وصغیرہ گناہ شامل ہوگئے، اس کی اگر کوئی جامع وآسان تعبیر ہو سکتی ہے تو یہی کہ حکومت وبادشاہت کا مقصود اقامتِ دین ہے، اب جس نظامِ حکومت کا منشا دینِ اسلام اور اس کے احکام کی تنفیذ ہو وہ اسلامی نظام حکومت ہے، اس کے قیام وبقاء کے لئے کوشش کرنا اسلامی نظامِ سیاست کہلائے گی اور جو نظم اس پیمانہ پر پورا نہ اترے یعنیٰ یا تو سیاست وحکومت کا مقصود اقامتِ دین نہ ہو یا طریقِ کار قرآن وسنت کی تعلیمات سے متصام ہو وہ اسلامی نظام حکومت وسیاست کہلانے کی کسی طرح مستحق نہیں ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین نے اپنے اپنے زمانے میں سیاست وحکومت کی جو ترتیب اختیار فرمائی تھی وہ اس آیت کریمہ کی پوری پوری مصداق تھی جس کا اوڑھنا بچھونا اقامتِ دین اور احکامِ اسلام کا نفاذ تھا اور اگر عقلی طور پر غور وتدبر سے کام لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان حضرات نے حکومت کا جو کچھ طریقہ کار اپنایا تھا اس کے بغیر اقامتِ دین کا تصور کرنا مشکل ہے، مکمل اسلام کو عملی جامہ پہنانے اور اس کو ایک زندہ جاوید دین ومذہب کی حیثیت سے نافذ کرنے کا یہی واحد قابلِ عمل راستہ ہے جس پر خلفاء راشدین گامزن تھے، اس سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ جو لوگ قیامِ خلافت کو امتِ مسلمہ کے اجتماعی فرائض میں سے شمار کرتے ہیں ان کی بات اپنی جگہ بالکل درست ہے۔

لہٰذا اسلامی نظامِ حکومت وہی کہلائے گی جس کا نصب العین ہی اقامت دین ہو اور ظاہر ہے کہ صرف زبان سے نام لینے سے کوئی چیز مقصود اور نصب العین نہیں بن جاتی جبکہ نظریاتی طور پر بھی اور عملی سطح پر بھی اس چیز کو مد نظر نہ رکھا جائے، اس لئے صحیح اسلامی حکومت وہی ہے جو نظریاتی اور عملی، ہر سطح پر بھی دین اسلام کی تعلیمات وہدایات کے تابع ہو اور اس کا کوئی شعبہ ونظام دینِ اسلام کے احکام سے متصادم نہ ہو۔

قرآن وسنت میں نظام اور طرزِ حکومت سے جتنی نصوص متعلق ہیں ان سب کا حاصل تقریباً یہی ہے۔

اسلام اور جمہوریت

اسلام کے اس نظریہ حکومت کو سمجھنے کے بعد جب ہم جمہوریت کے ساتھ اس کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں تو صاف طور پر دکھائی دیتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ایسے متضاد ہیں کہ کہیں یکجا جمع نہیں ہوسکتے، دونوں میں نظریاتی، عملی اور مشاہداتی طور پر اس حد تک تغایر ہے جن کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اسلامی نظامِ حکومت (جس کو بجا طور پر خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے) کا بنیادی مقصد اقامتِ دین ہے جبکہ جمہوریت کا مقصود یہ نہیں ہے چنانچہ دین کا جامع تصور تو قاموسِ جمہوریت میں سرے سے موجود ہی نہیں، جمہوری حکومت کا مقصود مؤلف کے کہنے کے مطابق یہ ہے کہ اجتماعی معاملات عوام کی اکثریت کی رائے کے مطابق انجام پائیں، عوام کی اکثریت کی رائے کسی چیز کی پابند نہیں، ان کی رائے حرف اخیر کی حیثیت رکھتی ہے خواہ وہ کسی دین وشریعت کے مطابق ہو یا مخالف، خلافت اور اسلامی نظم حکومت میں دین وشریعت کی بالادستی ہوتی ہے جبکہ جمہوریت میں عوام کی۔

تضاد ہو تو ایسا

یہ دونوں نظامہائے مملکت کے درمیان جوہری فرق ہے اور یہ صرف ایک فرق ہی نہیں ہے جس کو ہلکا سمجھا جائے اور دونوں نظاموں کے درمیان قدرِ اشتراک تلاش کرکے اس فرق کو ناقابل اعتناء رکھا جائے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اغراض ومقاصد کا ایک فرق اپنے دامن میں بیسیوں فروق رکھتا ہے، مثال کے طور پر عام جانور اور انسان کے درمیان ایک عقل ہی کا فرق ہے لیکن یہ ایک فرق سینکڑوں جزوی امور میں اشتراک سے زیادہ بھاری اور وزنی ہے اور اسی ایک فرق کی وجہ سے دونوں کے نام وکام اور مقام ومرتبہ میں اس حد تک فرق پیدا ہوا جس کی وجہ سے دونوں چیزیں بالکل جدا جدا حقیقت کی حیثیت اختیار کرگئی ہیں حالانکہ دیکھا جائے تو ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان وغیرہ دسیوں چیزیں دونوں کے درمیان مشترک بھی ہیں، یوں ہی خلافت وجمہوریت کے درمیان اس ایک بنیادی فرق کی وجہ سے دونوں کے درمیان قدم قدم پر اس حد تک تضاد وتصادم کی فضاء قائم ہوجاتی ہے جس کے ہوتے ہوئے دونوں نظامہائے مملکت ایک جگہ سفر نہیں کرسکتے، دونوں کے اہداف بھی الگ اور طریقِ عمل بھی مختلف ہے۔

خلافت وجمہوریت کا فرق

مقصود کا یہی ایک فرق ہے جس کی وجہ سے دونوں نظاموں کے درمیان بیسیوں تضادات پیدا ہوئے، جن کا ایک مختصر سا نمونہ یہ ہے کہ:

انتخاب امیر کا فرق اور انتخابات کے مفاسد

ا۔ خلافت میں خلیفہ وامیر کے انتخاب کا طریقہ کار یہ ہے کہ اہل حل وعقد کسی صالح ومناسب شخص کا انتخاب کریں، جبکہ جمہوریت میں انتخابات کا طوفان آزمایا جاتا ہے، اور انتخابات کی حیثیت دین واسلام اور ایمان وتقویٰ کی زندگی کے لئے ایسی ہی ہوتی ہے جو شہر وآبادی کے لئے سونامی طوفان کی ہوتی ہے، انتخابات کے چند ایک دنوں میں ملک عزیز میں جھوٹ وفریب، وعدہ خلافی اور معاہدہ شکنی، غیبت وتہمت تراشی، رشوت ستانی، اسراف وتبذیر، فحاشی وبے حجابی، جھوٹی قسموں، نماز اور صلہ رحمی وغیرہ دینی ومعاشرتی واجبات وحقوق کے ضیاع، وغیرہ طرح طرح کے گناہوں کا امڈتا ہوا سیلاب ہوتا ہے جس سے معاشرے کے چھوٹے بڑے، مرد وعورت سب کے دامن گندے ہوجاتے ہیں، دردِ دل اور دیانت وانصاف کی نظر سے اگر دیکھا جائے کہ ان دنوں میں پورے ملک کے طول وعرض کتنے لوگ گناہ میں ملوث ہوجاتے ہیں اور کتنی بار ان گناہوں کو دہرایا جاتا ہے؟ تو واضح ہوجائے گا کہ یہ ایام گناہوں اور معاصی کا موسم ہے اور اس طوفان بدتمیزی میں بلامبالغہ لاکھوں منکرات کا ارتکاب ہوتا ہے۔

امن اور فساد کا مفہوم

اگر اس کے باوجود جمہوریت کے فضائل میں سے "پر امن طریقہ پر انتقال اقتدار" کو گنوایا جائے جیسا کہ فاضل مؤلف نے تحریر فرمایا ہے، تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ کہنے والے کے نزدیک امن کا معیار وہ نہیں ہے جو ایک مسلمان کا معیار ہونا چاہئے، دین وشریعت کی زبان میں فساد محض

مسلح جنگ ہی کو نہیں کہاجاتا جس سے بچنے کو امن قرار دیاجائے یہ تو خالص مادی اور مغربی تصور ہے، شریعت کی روشنی میں قرآن وسنت کے احکام کی خلاف ورزی فساد ہے خواہ ظاہر میں جنگ کی کوئی صورت نہ ہو، لہٰذا اگر کچھ لوگ خوشی خوشی سود، جوا، بدکاری وغیرہ کسی بھی گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو ظاہر میں وہ کتنے ہی شیر وشکر کیوں نہ ہوں لیکن شریعت کی نظر میں وہ ہے فساد، اسی طرح اگر کوئی بندہ خدا شریعت کی سربلندی کے لئے شرعی احکام کی روشنی میں مسلح جنگ وجہاد کرتا ہے تو بظاہر یہ جنگ وفساد ہی کیوں نظر نہ آئے لیکن شریعت کی نگاہ بصیرت میں یہ ہے امن۔

امام طبری رحمہ اللہ سورہ بقرۃ کی آیت کریمہ "لاتفسدوا فی الارض" کی تفسیر میں ذکر فرماتے ہیں:

أما "لا تفسدوا في الأرض"، فإن الفساد، هو الكفر والعملُ بالمعصية.

اس کے بعد اپنی سند کے ساتھ حضرت ربیع سے نقل کرتے ہیں کہ:

عن الرَّبيع: (وإذا قيل لهمْ لا تفسدوا في الأرض) يقول: لا تعْصُوا في الأرض (قالوا إنما نحن مصلحون)، قال: فكان فسادُهم ذلك معصيةَ الله جل ثناؤه، لأن من عَصىٰ الله في الأرض أو أمر بمعصيته، فقد أفسدَ في الأرض، لأن إصلاحَ الأرض والسماء بالطاعة[2]

ترجمہ: ربیع سے روایت ہے: کہ ان (منافقوں) کا زمین میں فساد پھیلانا یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کیا کرتے تھے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور گناہوں کی دعوت دی اس نے زمیں میں فساد پھیلایا، اس لئے کہ زمین وآسمان کی اصلاح اور درستگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے۔

مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب رحمہ اللہ نے بجا طور پر فرمایا کہ:

"فساد اور اصلاح متضاد چیزیں ہیں، اعتدال کی حالت کو اصلاح، اور اعتدال سے خروج کو فساد کہتے ہیں، لڑائی بھڑکانا، فتنہ برپا کرنا، کافروں سے دوستی، مسلمانوں سے دھوکا، ان کے رازوں کا افشاء، گناہوں کا اظہار، دین کی اہانت، قوانین شریعت کی خلاف ورزی، یہ سب فساد فی الارض کے کام ہیں، ان لوگوں کے نزدیک فلاح اور اصلاح محض معاش کی درستگی ہے یہ لوگ نظام حق کو بگاڑتے ہیں، عبادت الٰہی کی بجائے کفر وشرک کے مرتکب ہوتے ہیں، غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، یہی فساد ہے، امام طبری اور ابن کثیر، متعدد مفسرین کرام سے روایت کرتے ہیں کہ "اصلاح الارض والسماء بالطاعۃ" زمین وآسمان کی اصلاح اطاعت کے ذریعے ہوسکتی ہے ا، اطاعت ہوگی تو ارض وسماء کے معاملات درست ہوں گے، اگر اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے رسول کی اطاعت نہیں ہوگی تو زمین پر فساد کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور منافقین یہی کچھ کرتے ہیں۔"[3]

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے بھی اس نکتہ کو آشکارا فرمایا:

اللہ سے کرے دور تو تعلیم بھی فتنہ
املاک بھی اولاد بھی جاگیر بھی فتنہ
ناحق کے لئے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ
شمشیر ہی کیا نعرہ تکبیر بھی فتنہ

---

[2] جامع البيان ت شاكر، ج۱ص ۲۸۸)

[3] معالم العرفان، ج۲ص۷۵

امن وفساد کے اس تصور کو سمجھنے کے بعد جب ہم غور کرتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ جمہوریت میں اقتدار کے انتقال کا جو طریقہ مروج ہے وہ پر امن نہیں ہے بلکہ فسادات کا ملغوبہ ہے اور اس میں جس قدر فسادات ہوتے ہیں وہ اس نظام بادشاہت کے طریقہ انتقال کی بنسبت کئی گنا زیادہ ہیں جس کی ظلم وزیادتی اور مذمت کا حد سے زیادہ ٹنڈورا پیٹا جاتا ہے۔

معیار انتخاب کا فرق

۲۔معیار انتخاب بھی جدا جدا ہے، خلافت کے لئے انتخاب کا معیار یہ ہے کہ آدمی نیک وصالح ہو اور نظم مملکت کو شرعی رہنمائی کی روشنی میں چلانے کا فن جانتا ہو، جمہوریت کے انتخاب کا معیار یہ نہیں ہے بلکہ اگر کسی ملک میں واقعی جمہوری نظام اور جمہوری اقدار قائم ہو تو وہاں معیار یہ ہے کہ عوام کی رائے پر زیادہ سے زیادہ چلنے والا ہو ان کو مادی لحاظ سے آرام وسکون پہنچا کر راضی کرنے والا ہو، ترقی پذیر ممالک میں انتخاب کا معیار یہ ہوتا ہے کہ مغربی استعمار کے لئے زیادہ مفید اور ان کی اشاروں پر چلنے والا ہو، جن ممالک میں مالی خیانت اور بد دیانتی کی وباء ہوتی ہے وہاں عوام کی طرف سے انتخاب یہ ہوتا ہے کہ پورے ملک کے حقوق سے زیادہ سے زیادہ انہی کی جولیاں بھر دی جائیں۔

مدت انتخاب

۳۔مدت انتخاب بھی دونوں نظاموں میں مختلف ہے، خلیفہ کا انتخاب کسی محدود مدت تک کے لئے نہیں ہوتا جس کے بعد وہ بلا وجہ معزول ہو جائے گا، بلکہ ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے البتہ کسی وجہ سے خلافت کی اہلیت باقی نہ رہے تو اس کا ایک خاص شرعی طریق کار ہے، جبکہ جمہوریت میں ایک خاص مدت کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے جس کے بعد وہ چاہے نہ چاہے، بہر حال معزول ہو ہی جاتا ہے۔

انتخاب کے بعد

۴۔انتخاب کے بعد "امیر" یا "وزیر" جمہوریہ کی ذمہ داریاں بھی مختلف اور بالکل مختلف ہیں، اسلامی نظام حکومت کا امیر اس بات کا پابند ہے کہ کسی بھی فیصلہ سے پہلے اس کو قرآن وسنت کے ترازو میں تولے، قابل مشاورت امور میں اہل حق وعقد کے شوریٰ سے مشاورت کرے اور اس کے بعد زیر بحث حادثہ میں قرآن وسنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے جو پہلو اس کو ملک وملت کے حق میں زیادہ مفید معلوم ہو اس پر عمل درآمد کرے، اس کے برعکس رئیس جمہوریہ کا کام یہ ہے کہ کسی بھی اہم فیصلہ کرنے سے پہلے پارلیمنٹ میں اس کو پیش کرے، اراکین پارلیمنٹ اس پر کھل کر بحث ومباحثہ کریں گے اور اس کے نتیجہ میں جس طرف اکثر اراکین کی رائے ہو اسی کو اختیار کرنا ہو گا، اس میں نہ قرآن وسنت کے دائرہ کار میں رہنے کی ضرورت ہے نہ ہی وزیر اعظم کے ذاتی رائے کا اعتبار ہے جبکہ اکثریت کی رائے اس کے برخلاف ہو۔

شوریٰ اور پارلیمنٹ میں فرق

اسلامی نظام حکومت کے شوریٰ اور جمہوری طرز حکومت کے پارلیمنٹ میں بحث ومباحثہ کا طریقہ کار، بظاہر دونوں چیزیں ایک جیسی لگتی ہیں کہ وہاں بھی اجتماعی رائے لیکر کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے اور جمہوریت میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے، اس ظاہری مشابہت کو دیکھتے ہوئے ماضی قریب میں بھی اور معاصرین میں سے بھی بہت سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ پارلیمنٹ کو اسلامی نظام حکومت کی شوریٰ یا اس جیسا قرار دیتے ہیں ،فاضل مؤلف بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک چیز نہیں ہے بلکہ دونوں کے درمیان تضاد کی نسبت ہے کیونکہ:

الف:شوریٰ میں جن اہل حل وعقد کی رائے لی جاتی ہے ان کا انتخاب صرف عقل مندی اور تجربہ کاری وغیرہ عناصر کی بناء پر نہیں ہوتا بلکہ ایمان وتقویٰ کے ترازو سے بھی ان کو تولا جاتا ہے جبکہ ارکان پارلیمنٹ کے انتخاب کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں ہے بلکہ عموماً دنیادار، سرمایہ کار اور ظالم وجاگیردار قسم کے لوگ ہی اس لیلیٰ مقصود تک پہنچ پاتے ہیں۔

ب:ارکان شوریٰ رائے دہی میں آزاد نہیں ہوتے بلکہ قرآن وسنت کے مقرر کردہ حدود کے پابند ہوتے ہیں اور اسی دائرہ میں رہتے ہوئے وہ کوئی مشورہ دے سکتے ہیں، جبکہ پارلیمنٹ کے اراکین اس بات کے مطلق پابند نہیں ہوتے، زیادہ سے زیادہ اگر وہ کسی چیز کے پابند کہلائے جاسکتے ہیں تو ملکی

آئین و قانون ہے جس کی بالا دستی کا حلف لے کر وہ پارلیمنٹ پہنچ پاتے ہیں، لیکن بعض صورتوں میں وہ خود آئین و قانون کو بھی تبدیل کر سکتے ہیں چنانچہ ہمارے ہاں ملک پاکستان میں دو تہائی اکثریت کی رائے پر آئین میں بھی ترمیم کی جاسکتی ہے۔

ج: امیر و خلیفہ شوریٰ کی رائے کا ہر حال میں پابند نہیں ہو تا چنانچہ بسا اوقات وہ شوریٰ کی رائے کو قرآن و سنت کے خلاف سمجھتا ہے یا اس کی بنسبت کسی دوسرے پہلو کو قرآن و سنت اور عوام کی مفاد و مصلحت کے قریب تر سمجھتا ہے تو اسی کو اختیار کرلیتا ہے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منصبِ خلافت سنبھال لینے کے بعد جب منکرین زکوۃ کے خلاف جہاد و قتال کا فیصلہ کیا اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت تقریباً تمام ارکان شوریٰ کی رائے اس کے خلاف تھی اور وہ اس اہم نازک موقع پر منکرین زکوۃ کے خلاف جہاد کرنے کے حق میں نہ تھے لیکن خلیفہ رسول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گویا تن تنہا یہ فیصلہ کیا اور اس کا عذر یہ بیان فرمایا کہ میرے نزدیک یہ لوگ بھی دیگر مرتدین کی طرح مرتد ہیں جن کا حکم یہی ہے کہ اسلام قبول کریں یا ان سے قتال کی جائے، اسی طرح مختلف مواقع پر حضرت ابو بکر صدیق وغیرہ خلفاء (رضی اللہ عنہم) نے شوریٰ کی اکثریت کی رائے کی پابندی نہیں کی۔

قرآن کریم میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو ارشاد فرمایا گیا:

{وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ} [آل عمران: ١٥٩]

"کام میں ان سے مشورہ لیا کر پھر جب تو اس کام کا ارادہ کر چکا تو اللہ پر بھروسہ کر بیشک اللہ توکل کرنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہے"

یہ تو اسلامی خلافت کے شوریٰ کی بات تھی، نظام جمہوریت میں رئیس جمہوریہ / وزیر اعظم، اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے کا پابند ہوتا ہے، اگر اس کی ذاتی رائے جمہور ارکان کے خلاف بھی ہو تو بھی اس کی یہ اوقات نہیں ہے کہ اکثریت کی بات چھوڑ کر کوئی فیصلہ کر سکے۔

اکثریت کی رائے سے متعلق ایک اشکال کا جائزہ

یہاں اعتراض کے طور پر یہ نکتہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ ذاتی رائے یا کم افراد کی رائے کے مقابلہ میں زیادہ افراد کی رائے واقعی زیادہ لائق اعتناء ہونی چاہئے کیونکہ جب اس جانب افراد کی تعداد زیادہ ہے تو ضرور سوچ و فکر کے کچھ زاوئے ضرور ایسے ہوں گے جن کی طرف دوسرے فریق کی ذہنی رسائی ہوئی ہوگی، لہٰذا اکثریت کی رائے کی پابندی کو جمہوریت کے عیوب و نقائص نہیں بلکہ فضائل و کمالات میں سے گردان لینا چاہئے۔

سرسری نظر میں یہ بات بڑی معقول اور وزنی ظاہر ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بات ہے بالکل بے وقعت، اکثریت کو نہ عقلاً کسی چیز کی حقانیت / صداقت پہچاننے کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے نہ ہی شریعت کی روشنی میں یہ کوئی معیار حق وصدق ہے، تجربہ شاہد ہے کہ دنیا میں عموماً عقل مندوں کی بنسبت بے عقل و کم عقل لوگوں کی کثرت ہوتی ہے اگر کہیں تکلف کر کر کے عقلمندوں کو یکجا جمع بھی کیا جائے تو بھی ان میں سے ایسے سلیم فطرت اور کامل عقل والے افراد کی تعداد کم ہی ہوتی ہے جن کے عقل و فکر کا آئینہ حرص ولالچ اور خوف و دباؤ کے داغ سے پاک ہو، اس لئے قرآن و سنت کے متعدد نصوص میں اس بات کی تعلیم دی گئی۔

سورۃ انعام میں ارشاد ہے:

{وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ} [الأنعام: ١١٦]

ترجمہ: "اور اگر تو کہا مانے گا اکثر ان لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تو تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دیں گے وہ تو اپنے خیال پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں"

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اکثریت کی خواہ مخواہ دشمنی کی جائے اور ان کی رائے کو کوئی وقعت نہ دی جائے، نہیں ایسا نہیں، بلکہ بعض جگہوں پر اکثریت کی رائے کا ایک حد تک اعتبار بھی ہوتا ہے، فقہاء حنفیہ نے بھی کسی مسئلہ میں اختلاف کے وقت بعض صورتوں میں ایک وجہ ترجیح کے طور پر اکثریت کو ذکر فرمایا ہیں جس کو فاضل مؤلف نے تحریر فرمایا ہے، لیکن اس سے اکثریت پر مبنی جمہوری فلسفہ پر استدلال کرنا مخدوش

ہے کیونکہ وہاں فقہاء کرام کے درمیان کسی حادثہ کے شرعی حکم کے متعلق اختلاف تھااور ظاہر ہے کہ فقہاء کااختلاف اجتہادی نوعیت کااختلاف ہوتا ہے جس میں ہر فریق قرآن وسنت کے نصوص میں اپنی استطاعت کے مطابق غور وفکر کرکے واقعی شرعی حکم تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اصل حکم خداوندی کی طرف کسی مجتہد کی رسائی ہوسکے یانہ، دونوں صورتوں میں اس کو اجر وثواب ملتا ہے، جبکہ پارلیمانی نظام میں ارکان پارلیمنٹ کانہ یہ مقصود ہوتا ہے نہ ہی عموماًان میں اس عظیم اور نازک کام کی لیاقت واستعداد ہوتی ہے۔

منافات کامعیار

دو چیزوں میں تغایر ومنافات کی بڑی صورت یہی ہوتی ہے کہ دونوں کامقصود اور طریق کار جدا جدا ہو، فقہی اور پارلیمانی اختلاف کی بھی آپس میں یہی نسبت ہے کہ دونوں کامقصود وغایت بھی الگ الگ ہے اور طریقہ کار بھی مختلف، فقہی واجتہادی اختلاف کامقصود اللہ تعالیٰ کے حکم تک رسائی ہے اور طریقہ کار یہ ہے کہ کسی بھی حادثہ پیش آنے کے بعد قرآن وسنت کے نصوص میں اس کاحل ڈھونڈاجائے اگر مل جائے تواس کو اختیار کیاجائے ورنہ تواجماع امت کی روشنی میں اس کاجواب تلاش کیاجائے اگر یہاں بھی کوئی جواب نہ مل سکے تواس کے بعد ایک خاص علمی وعملی استعداد رکھنے والے افراد اجتہاد وقیاس کے ذریعہ اس حادثہ کاشرعی حکم معلوم کرنے کی کوشش کریں، جبکہ پارلیمانی اختلاف کامقصود شرعی حکم تک پہنچنا نہیں ہے بلکہ ہر ہر پارٹی اپنے دستور ومفاد کی روشنی میں جس بات کو مناسب خیال کرتی ہے اس کو ثابت کرنااور منظور کروانا مدنظر ہوتا ہے اور عملی طریقہ کار میں قرآن وسنت کی کوئی پابندی نہیں ہوتی بلکہ زیادہ سے زیادہ ملکی آئین کالحاظ کرناہوتا ہے۔

مقصود اور طریقہ کار کے اس واضح وبدیہی تغایر وتضاد کے ہوتے ہوئے دونوں قسم کے اختلافات کو ایک جیسا سمجھنا اور پارلیمانی اختلاف کو فقہی اختلاف پر قیاس کرنا کسی طرح درست نہیں۔

قیام خلافت کے دلائل

"مسئلہ خلافت" علم کلام کی کتابوں کا مستقل مبحث ہے جہاں اس کاحکم، دلائل وغیرہ تفصیل کے ساتھ ذکر کئے جاتے ہیں، یہاں ان تمام مباحث کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ خلافت کے وجوب کے کچھ دلائل کو اختصار کے ساتھ ذکر کرنا ہے، علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "مقاصد الطالبین" میں متعدد دلائل ذکر فرمائے ہیں، یہاں اسی کی روشنی میں کچھ اضافہ کے ساتھ نمبروار کچھ دلائل ذکر کئے جاتے ہیں:

الف: بہت سے احادیث مبارکہ میں متعدد اسالیب کے ساتھ اس بات کی تاکید کی گئی، مثلاً بعض روایات میں ہے کہ جو شخص امام کی بیعت کئے ہوئے بغیر مراتووہ جاہلیت کی موت مرا، متعدد روایات میں حکام وامراء کے حکم ماننے کی تاکید کی گئی اور جائز امور میں ان کی اطاعت کوضروری قرار دیاگیا، جس سے مجموعی طور پر یہی بات نکلتی ہے کہ نصب امام بھی واجب ہے اور پھر جائز امور میں اس کی اطاعت بھی ضروری ہے۔

ب:اجماع امت:امت کااس بات پر اتفاق ہے کہ مسلمانوں پر کسی ایسے امیر / امام کاہوناضروری ہے جوان کے درمیان شرعی احکام نافذ کرتاہو، خود حضرات صحابہ کرام نے اس بات پر اتفاق کیاتھااوراسی اہمیت اور وجوب کے پیش نظر حضور ﷺ کی رحلت فرمانے کے فوراًبعد آپ ﷺ کی تکفین وتدفین سے بھی پہلے اس اہم حکم کی تعمیل فرمائی۔

ج: دین اسلام کے متعدد احکام اس نوعیت کی حامل ہیں کہ ہیں تووہ فرائض اور واجبات، لیکن حکومت کے بغیر اس کو پورا نہیں کیاجاسکتا، مثلاً حدود وقصاص وتعزیرات کانفاذ، اسلامی سرحدات کی حفاظت، وغیرہ۔

د: یوں توہر مصلحت کاحصول ضروری ہے نہ ہر ضرر سے بچنالازم، لیکن ضابطہ کے لحاظ سے بعض مصالح کاحصول ضروری ہوجاتاہے یوں ہی بعض مضر چیزوں کادفع کرنا بھی لازم ہوتا ہے، خلافت کے قیام کے ساتھ بھی ایسی ضروری نوعیت کے کچھ مصالح وابستہ ہیں جن کاحصول شریعت کی نظر میں ضروری ہے یوں ہی اسی خلافت کے سائے تلے ہی بہت سے ایسے مضر عناصر وفتن سے بچاجاسکتاہے جن سے بچناشرعاًضروری ہوتا ہے۔

ان جیسے دلائل کی وجہ سے سلف صالحین اور اس کے بعد کے ادوار کے تقریباً تمام اہل علم کا اس بات پر اتفاق رہاہے کہ خلافت کاقیام مسلمانوں کااجتماعی فریضہ ہے اور علماء امت کایہ اتفاق بجائے خود ایک مستقل دلیل ہے، ویسے توامامت وخلافت کامبحث، علم کلام اور شرعی سیاست،

ہر ایک علم وفن کا مستقل موضوع رہا ہے اور دونوں موضوعات کے مصادر و مراجع میں خلافت وامامت سے متعلق اہم اہم مباحث پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مذکور ہیں جس کی تفصیل کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہے، یہاں آسانی کے لئے مشت از نمونہ خروار کے طور پر بعض عبارات ذکر کی جاتی ہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

نظام أمر الدين مقصود لصاحب الشرع عليه السلام قطعاً، وهذه مقدمة قطعية لا يتصور النزاع فيها، ونضيف إليها مقدمة أخرىٰ وهو أنه لا يحصل نظام الدين إلا بإمام مطاع فيحصل من المقدمتين صحة الدعوىٰ وهو وجوب نصب الإمام... فبان أن السلطان ضروري في نظام الدنيا، وقيام الدنيا ضروري في نظام الدين، ونظام الدين ضروري في الفوز بسعادة الآخرة وهو مقصود الأنبياء قطعاً، فكان وجوب نصب الإمام من ضروريات الشرع الذي لا سبيل إلىٰ تركه فاعلم ذلك.[٤]

ترجمہ: پہلا مقدمہ یہ ہے کہ دین کا نظام بر قرار رکھنا شارع علیہ السلام کا مقصود ہے اس میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ دین کا نظام تب ہی بر قرار رکھا جاسکتا ہے جب ایک ایسا امام موجود ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ ان دو مقدموں سے ہمارا دعوی ثابت ہوتا ہے کہ امام کا مقرر کرنا ایک امر ضروری ہے۔ لہذا یہ بات واضح ہوئی کہ دنیا کے نظام میں سلطان کا مقرر کرنا ضروری ہے، اور دین کے نظام کو بر قرار رکھنے کے لیے دنیا کا نظام بر قرار رکھنا ضروری ہے، اور آخرت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے دین کے نظام کو بر قرار رکھنا ضروری ہے اور یہ سعادتِ آخرت انبیائے کرام علیہم السلام کا مقصودِ اصلی ہے۔ (اور چونکہ یہ تمام چیزیں تب ہی ممکن ہیں جب ایک ایسا امام موجود ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو) تو (اس سے معلوم ہوا کہ) امام کا مقرر کرنا ضروریاتِ دین میں سے ہے اور اس کے چھوڑنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

علامہ آمدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

مذهب أهل الحق من الإسلاميين أن إقامة الإمام واتباعه فرض على المسلمين شرعا لا عقلا وذهب أكثر طوائف الشيعة إلىٰ وجوب ذلك عقلا لا شرعا وذهب بعض القدرية والخوارج إلىٰ أن ذلك ليس واجبا لا عقلا ولا شرعا.. قال أهل الحق الدليل القاطع علىٰ وجوب قيام الإمام واتباعه شرعا ما ثبت بالتواتر من إجماع المسلمين فى الصدر الأول بعد وفاة رسول الله صلى الله عليه وسلم علىٰ امتناع خلو الوقت عن خليفة وإمام[٥]

ترجمہ: اہلِ حق کا مذہب یہ ہے کہ امام کا مقرر کرنا اور اس کی اتباع کرنا مسلمانوں پر فرضِ شرعی ہے نہ کہ فرض عقلی۔ اور اہلِ شیعہ کے اکثر جماعتوں کا مذہب یہ ہے کہ یہ فرض عقلی ہے نہ کہ فرضِ شرعی۔ اور بعض قدریہ اور خوارج کا مذہب یہ ہے کہ امام کا مقرر کرنا نہ عقلا ضروری ہے اور نہ شرعا ضروری ہے۔ اہلِ حق اپنی اس بات کی یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرنِ اول میں رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہو چکا تھا کوئی ایسا وقت نہیں گزرنا چاہیے جس میں مسلمانوں کا امام اور خلیفہ نہ ہو۔

مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:

---

[٤] الاقتصاد في الاعتقاد ،الباب الثالث في الامامة ص: ١٢٧

[٥] غاية المرام في علم الكلام،الطرف الأول فى وجوب الإماكة وما يتعلق بها،ص: ٣٦٤

ثمّ إنّ نصب الإمام واجب قد عرف وجوبه في الشّرع بإجماع الصّحابة والتّابعين لأنّ أصحاب رسول الله صلّى الله عليه وسلّم عند وفاته بادروا إلى بيعة أبي بكر رضي الله عنه وتسليم النّظر إليه في أمورهم وكذا في كلّ عصر من بعد ذلك ولم تترك النّاس فوضى في عصر من الأعصار واستقرّ ذلك إجماعا دالا على وجوب نصب الإمام.[6]

ترجمہ: امام کا مقرر کرنا ضروری ہے اور اور اس کا ضروری ہونا اجماعِ صحابہ اور تابعین سے ثابت ہے۔ اور جب رسول اللہ ﷺ اس دارِ فانی سے کوچ فرما گئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے اور ان کو اپنے امور کی نگرانی حوالہ کرنے میں جلدی کی۔ اور یہ بات بعد کے زمانے میں بھی چلتی رہی لوگوں کو کسی بھی زمانے میں افراتفری میں منتشر نہیں چھوڑا گیا، الخ۔"

علامہ کاسانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں؛

نصب الإمام الأعظم فرض، بلا خلاف بين أهل الحق، ولا عبرة بخلاف بعض القدرية لإجماع الصحابة رضي الله عنهم على ذلك، ولمساس الحاجة إليه؛ لتقيد الأحكام، وإنصاف المظلوم من الظالم، وقطع المنازعات التي هي مادة الفساد، وغير ذلك من المصالح التي لا تقوم إلا بإمام[7]

ترجمہ: امام کا مقرر کرنا فرض ہے اور اس میں اہلِ حق کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو بعض قدریہ نے اختلاف کیا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا ہے، نیز احکام کی پابندی کروانے کے لئے، مظلوم کو ظالم کے ظلم سے نجات دلانے کے لئے، اور ان منازعات کو ختم کرانے کے لئے جو فساد کی جڑ ہے امام کی تقرری کی طرف محتاج ہیں۔ اور اس کے علاوہ کئی مصالح ہیں جن کا حصول امام کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

اجماعیات کے مسائل پر معاصرین کے ایک جماعت نے "موسوعۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی" کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی، اس میں ہے:

أجمع سلف الأمة، وأهل السنة، وجمهور الطوائف الأخرى على أن نصب الإمام -أي توليته على الأمة- واجب على المسلمين شرعًا لا عقلًا فقط،... قال ابن حزم: "اتفق جميع أهل السنة، وجميع المرجئة، وجميع الشيعة، وجميع الخوارج، على وجوب الإمامة، وأن الأمة واجب عليها الانقياد لإمام عادل، يقيم فيهم أحكام اللهَّ، ويسوسهم بأحكام الشريعة التي أتى بها رسول اللهَّ صلى اللهَّ عليه وسلم حاشا النجدات من الخوارج فإنهم قالوا لا يلزم الناس فرض الإمامة...وقول هذه الفرقة ساقط، يكفي من الرد عليه وإبطاله: إجماع كل من ذكرنا على بطلانه، والقرآن والسنة قد وردا بإيجاب الإمام". وقال القرطبي: "ولا خلاف في وجوب ذلك بين الأمة ولا بين الأئمة، إلا ما رُوي عن الأصم، حيث كان عن الشريعة أصم، وكذلك كل من قال بقوله واتَّبعه على رأيه ومذهبه"[8]

ترجمہ: امت کے اسلاف، اہل السنۃ اور ان کے علاوہ دیگر جماعتوں کا اس بات پر اجماع کیا ہے کہ مسلمانوں پر امام کا مقرر کرنا صرف عقلا ضروری نہیں ہے بلکہ شرعا بھی ان پر لازم ہے۔ علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں: اہل السنۃ، مرجئہ، شیعہ اور خوارج کے تمام فرقوں نے امامت کے وجوب پر اجماع کیا ہے۔ اور امت پر امامِ عادل کا اتباع لازم ہے جو ان میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کو قائم کرتا ہے اور مسلمانوں کی

---

[6] تاريخ ابن خلدون،مقدمة،ج١ص ٢٣٩

[7] بدائع الصنائع ،كتاب آداب القاضي،ج٧ص٢

[8] موسوعة الإجماع في الفقه الإسلامي،ج٥ص ٥٧

بنیاد اس شریعت پر بناتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہے۔ اور اس بات میں خوارج میں سے نجدات اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں پر امام کا مقرر کرنا ضروری نہیں ہے، اور اس فرقہ کے اس قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس قول کے رد اور ابطال کے لیے امت کا اجماع کافی ہے۔ اور قرآن وسنت امام کے نصب کے بارے میں وارد ہیں۔ امامِ قرطبیؒ فرماتے ہیں: اور اس بات (یعنی امام کے مقرر کرنے کے بارے میں نہ امت کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور نہ ہی ائمہ کے درمیان سوائے اصم کے جو کہ واقعۃً حق سے اصم (بہرا) تھا، اسی طرح جن لوگوں نے اس کے قول اور مذہب کو اختیار کیا۔

چند صفحات بعد نصب امام کا معنی اور اس کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

ونصب الإمام في الاصطلاح: اختيار خليفة للمسلمين نيابة عن صاحب الشريعة في حفظ الدين وسياسة الدنيا؛ ليقيم فيهم أحكام اللهّ -تعالىٰ-، ويسوسهم بأحكام الشريعة، وتجتمع به الكلمة، وتنفذ به أحكام الخلافة. وبهذا المعنیٰ فإن نصب الإمام واجب بإجماع العلماء.[9]

ترجمہ: امام نصب کرنے کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک خلیفہ کا تعین کیا جائے اور یہ صاحبِ شریعت سے امورِ دین ودنیا کی حفاظت میں نیابت تصور ہوگا تاکہ خلیفہ ان مسلمانوں میں اللہ تعالیٰ کے احکامات قائم کرے اور ان کی بنیاد احکامِ شرعیہ پر بنائے اور تاکہ اس کے ساتھ مسلمانوں کے اقوال جمع ہوں اور اسی کے ذریعے خلافت کے احکام نافذ ہوجائیں۔ اور نصبِ امام کا جو معنی کیا گیا تو اس معنی کے اعتبار سے تمام علمائے کرامؒ کا اس بات پر اجماع ہے کہ نصبِ امام واجب ہے۔

ان عبارات سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ امامت وخلافت کا قیام ایک شرعی ذمہ داری ہے اگرچہ اس بات میں اختلاف ہے کہ اس کا وجوب محض دلیل عقلی سے ثابت ہے یا نقلی دلائل سے، لیکن ہے واجب دونوں کے نزدیک، ابو بکر اصم وغیرہ جن لوگوں نے اس کو سرے سے واجب ہی نہیں کہا، قطع نظر کرتے ہوئے کہ درج بالا دلائل کے ہوتے ہوئے ان کے اختلاف کا اعتبار ہے یا نہیں؟ خود ان کی بات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اختلافی موقف صرف نظریاتی حد تک واجب ہونے نہ ہونے میں ہے یا اپنے زعم کے مطابق کسی مصلحت کی بناء پر یہ اختلاف ان سے منقول ہے، عملی طور پر اس کے واجب ہونے میں کلام نہیں ہے۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ اصم اور بعض خوارج کا خیال نقل کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک خلیفہ مقرر کرنا لازم نہیں، فرماتے ہیں:

"وقد شذ بعض الناس فقال بعدم وجوب نصب الخليفة رأسًا لا بالعقل ولا بالشرع، منهم الأصم من المعتزلة وبعض الخوارج وغيرهم. والواجب عند هؤلاء إنما هو إمضاء أحكام الشرع فإذا تواطأت الأمة على العدل وتنفيذ أحكام الله تعالیٰ لم تحتج إلى إمام ولا يجب نصبه. وهؤلاء محجوجون بالإجماع والذي حملهم علیٰ هذا المذهب إنما هو الفرار من الملك ومذاهبه من الاستطالة والتغلب والاستمتاع بالدّنيا لمّا رأوا الشّريعة ممتلئة بذمّ ذلك والنّعي علیٰ أهله ومرغّبة في رفضه.[10]

حاصل ترجمہ: اور بعض لوگوں نے امام کے مقرر یہ قول کیا ہے کہ خلیفہ کرنا سرے سے ضروری نہیں ہے نہ عقلا اور نہ شرعا۔ ان میں معتزلہ میں سے اصم اور بعض خوارج شامل ہیں۔ اور ان لوگوں کے نزدیک شرع کے احکام کو جاری کرنا ضروری ہے تو جب امت عدل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے پر متفق ہوجائیں تو امام کا مقرر کرنا ضروری نہیں ہے۔ اور ان کے خلاف اجماع دلیل ہے اور اس قول کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہوں کے ناجائز حرکات سے چھٹکارا حاصل کیا جائے"۔

[9] موسوعة الإجماع في الفقه الإسلامي، ج٥ص٦٨

[10] تاريخ ابن خلدون ،الفصل السادس والعشرون، ج ١ص ٢٣٩

اس سے واضح ہوا کہ اسلامی نظام حکومت وخلافت کا قیام امت مسلمہ کے اجتماعی فرائض وواجبات میں سے ایک ہے اور یہ دیگر فرائض کی طرح ایک عام واجب ہی نہیں ہے بلکہ دسیوں نوعیت کے واجبات اسی ایک فریضہ کے ساتھ متعلق ہیں جن کا کما حقہ پورا کرنا خلافت کا سہارے لئے بغیر بڑا مشکل ہے اس لئے عام واجبات کی بنسبت یہ ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل اور بنیادی فریضہ ہے جس میں کوتاہی کرنا کسی طرح روا نہیں ہے حضرات صحابہ کرام کے طرز عمل سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ کے انتقال فرمانے جیسے جانکاہ حادثہ کے فوراً بعد جو الم وغم کا سماں تھا اس انتہائی درد وکرب کے عالم میں بھی اس ذمہ داری کے نبھانے میں تاخیر سے کام نہیں لیا حتی کہ حضور ﷺ کی تکفین وتدفین پر بھی اس کام کو مقدم رکھا۔

مغربی طاقتوں کے حربے

اسلام دشمن طاقتوں سے یہ راز پوشیدہ نہیں ہے کہ یہی قیامِ خلافت ہی ایک ایسی چھتری ہے جس کے سائے تلے امت مسلمہ یکجا اور ہم فکر وہم نوالہ رہ سکتی ہیں، اور اسی سایہ عاطفت میں ابناء اسلام کی تنظیم وتربیت ہوتی ہے اس لئے انہوں نے اسی فریضہ کے خلاف سیف وسنان کی دشوار گزار راستہ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ فکری جنگ میں بھی بھرپور حصہ لیا اور اس بات کی سرتوڑ کوشش کی بلکہ ان کی محنت کا تسلسل آج تک جاری ہے کہ اس فریضہ کے فریضہ ہونے کا احساس ہی امت کے دلوں سے رخصت ہو جائے، جب دل ودماغ سے اس کا احساس جاتا رہے گا تو اس کے بعد اس کے لئے محنت کرنے اور جان کھپانے کا کیا معنیٰ؟

اس کام کے کے لئے ابناءِ اسلام ہی میں سے کچھ افراد سے (دانستہ یا نادانستہ طور پر) ان کو بیش بہا فائدہ حاصل ہوا جنہوں نے اسلام کے طریقہ سیاست وخلافت کے خلاف کوئی علمی / تحریری یا تقریری کام کیا، اس کی بڑی مثال مصر کے شیخ علی عبد الرزاق ہے جنہوں نے ایک عرصہ پہلے "الاسلام واصول الحکم" کے نام سے کتاب لکھ کر یہی بات ثابت کرنے پر زور صرف کیا کہ حکومت وخلافت شریعت کی نظر میں کوئی ضروری ولازم نہیں ہے اور اسلام نے کہیں خلافت کرنے کا حکم نہیں دی، اس کتاب کی بدولت مصر کے علمی ودینی وسیاسی حلقہ میں اضطراب وبے چینی کی کیفیت پیدا ہوگئی، وطن عزیز پاکستان میں چند سال پہلے جناب جاوید احمد غامدی نے روزنامہ جنگ میں "اسلام اور ریاست، ایک جواب بیانیہ" کے نام سے ایک کالم لکھا جس کا حاصل یہی تھا کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور مسلمانوں پر شریعت کی طرف سے یہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ زمین میں اسلامی خلافت کا نظام قائم کریں، زیر نظر کتاب سے بھی ایک عام قاری کو یہ تاثر ملتا ہے کہ جمہوریت اسلامی نظام حکومت کی ترقی یافتہ، قابل عمل اور مفید شکل ہے۔

ان جیسے دانش مندوں میں سے جو کچھ دینی فکر وغم کی نعمت سے آشنا ہو یا قارئین کے جذبات واحساس کا لحاظ رکھتے ہوئے نفاذ اسلام کی پہلو پر بھی توجہ مرکوز رکھتے ہیں تو وہ یہی تجویز دیتے ہیں کہ جمہوریت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی نفاذ اسلام کی کوشش کی جائے اور اس مدعٰی کے لئے وہ آزادی اظہار رائے، مساوات اور جمہوریت کے دیگر فضائل ومناقب کا ورد کرنا شروع فرماتے ہیں کہ یہ فضائل کسی نظام حکومت میں موجود ہیں نہ ہی اس کے بغیر کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتی ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر جمہوریت کی ماہیت وحقیقت اور اس کی تاریخ واثرات پر ٹھنڈے دل اور روشن دماغ کے ساتھ غور کیا جائے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ یہ نظام حکمرانی وادی تیہ کی عملی تصویر اور اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے جس کو انہی لوگوں نے دنیا میں رائج کیا ہے جو خود وادی تیہ کی زندگی کا تجربہ کرچکے ہیں، اسلامی دنیا کے مختلف جمہوری حکومتوں کے احوال سے واقفیت رکھنے والوں کے لئے اب یہ بات مخفی نہیں رہی کہ مساوات وحریت وغیرہ جن جمہوری اقدار کا ڈنڈورا پیٹا جاتا ہے وہ تبھی ہے جبکہ اس میں اسلام اور اسلامی قانون کی آمیزش نہ ہو، جہاں اس فلسفہ کے سہارے کسی واقعی اسلامی نظمِ حکومت کے قیام تک رسائی ہو جائے وہاں طاقت وسازش کے زور سے ایسے مذہبی عناصر کو کچل کر رکھنا لازم ہو جاتا ہے۔

ہم کسی پر بلاوجہ کوئی بدگمانی نہیں کرتے بلکہ یہی خیال کرتے ہیں کہ مسلمان نیک نیتی کے ساتھ ہی کوئی دینی کام کرتا ہے خصوصاً اہل علم جب کسی موضوع پر بحث ومباحثہ کا آغاز کرتے ہیں تو خدمت دین اور رضائے خداوندی کا جذبہ ہی کارفرما ہوگا، تاہم اس بات سے بھی پہلو تہی نہیں کی جاسکتی

ہے کہ بحث ومباحثہ کا بھی کوئی دائرہ کار اور طریقہ کار ہونا ضروری ہے، امت مرحومہ کی موجودہ افسوس ناک حالات میں اجماعی نوعیت کے مسائل کو مباحثہ ومکالمہ کا موضوع بنانے کی آخر ضرورت کیا ہے ؟ اور پھر اگر انہی مسائل کو موضوع بحث بنانے کی ضرورت ہو تو بھی سرسری مطالعہ اور سطحی دلائل کے بل بوتے اتفاقی مسائل کو تختہ مشق بنا کر ایسی صورت میں پیش کر دینے کا کیا جواز ہو سکتا ہے جس سے قاری تردد وتذبذب کا شکار ہو کر رہ جائے ؟

ایک جدید اشکال کا جواب

فریضہ خلافت کے متعلق بعض حلقوں کی جانب سے ایک اشکال بڑے زور وشور سے اٹھایا جاتا ہے کہ حدود وقصاص وغیرہ جتنے واجبات خلافت وحکومت حاصل کرنے کے ساتھ وابستہ اور اس پر موقوف ہیں، ان کی ذمہ داری امت پر ابھی عائد ہی نہیں ہوتی، لہٰذا ان واجبات کی تکمیل وتعمیل کے لئے قیام خلافت کو کیونکر فرض یا واجب قرار دیا جا سکتا ہے ؟ مثال کے طور پر صاحب نصاب شخص پر اپنے مال کا کچھ حصہ بطورِ زکوۃ دیدینا فرض ہے لیکن فرضیت کا یہ حکم تب ہی متوجہ ہو گا جبکہ کوئی شخص عملی طور پر صاحب نصاب ہو، خاص اس فریضہ کو پورا کرنے کے لئے نصاب کے بقدر مال حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔

لیکن اس اشکال کی حیثیت ایک سطحی شبہ سے زیادہ نہیں ہے کیونکہ اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ:

۱۔ شریعت نے خود خلافت کے قیام کا حکم نہیں دیا، صرف ان چند واجبات کا حکم دیا ہے جو قیام خلافت کے بعد مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۲۔ ان واجبات کو بھی حتمی طور پر واجب قرار نہیں دیا گیا بلکہ خلافت پر موقوف چھوڑ دیا گیا کہ اگر آپ لوگوں کی جولی میں خلافت کی چابی نازل ہو گئی تو اس کے بعد ان واجبات کا لحاظ رکھنا۔

جبکہ یہ دونوں مفروضے غلط ہیں، خلافت قائم کرنا گو شرعاً مقصود اصلی نہیں ہے لیکن کئی واجبات وفرائض کے اس پر موقوف ہونے کی وجہ سے مستقل فریضہ ہے جس کی دلیل ایک تو وہ نصوص ہیں جن میں اقامت دین کا حکم دیا گیا، چونکہ پورے دین کی اقامت خلافت کے بغیر شرعاً ممکن ہے نہ عقلاً کہیں ایسا واقع ہوا، اس لئے خود خلافت کا قیام بھی لازم ہے، دوسری بڑی دلیل وہ نصوص ہیں جو اس باب میں صریح ہیں، مثلاً صحیح مسلم میں حضرت نافع سے روایت ہے کہ یزید کے دور حکومت میں جب واقعہ حرۃ کا افسوس ناک حادثہ واقع ہوا، تو حضرت عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن مطیع کے پاس گئے اور ان سے عرض کیا:

> إني لم آتك لأجلس، أتيتك لأحدثك حديثا سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقوله: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «من خلع يدا من طاعة، لقي الله يوم القيامة لا حجة لـه، ومـن مـات ولـيس في عنقه بيعة، مات ميتة جاهلية»[11]

> ترجمہ: میں بیٹھنے کے لئے نہیں آپ کے پاس نہیں آیا بلکہ اس لئے آیا تا کہ اس کو حدیث سناؤں میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "جو شخص (امام کی) اطاعت سے ہاتھ کھینچے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہو گی اور جو شخص اس حال میں مرے کہ اس کی گردن میں (کسی امام کی) کوئی بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کے موت مرا"۔

اس روایت کا دوسرا حصہ اس باب میں بالکل صریح ہے کہ جو شخص کسی امام کی بیعت کے بغیر مرا وہ جاہلیت کی موت مرا، اصولی طور پر کسی متعین چیز کو جاہلیت کی چیز قرار دینا اس کی مذمت وممانعت کی دلیل ہوتی ہے کیونکہ جاہلیت اسلام کی ایسی ضد ہے جس کے مٹانے کے لئے اسلام کا سورج طلوع ہوا۔

---

[11] صحيح مسلم،باب الأمر بلزوم الجماعة عند ظهور الفتن وتحذير الدعاة إلى الكفر

اس کے علاوہ حضرات صحابہ کرام اور سلف صالحین کا علمی و عملی طور پر اجماع واتفاق بھی اس بات کی دلیل ہے کہ قیام خلافت ایک مستقل فریضہ ہے جو امت کے کندھوں عائد ہوتا ہے۔

وہی پرانی بات

اگر اس اشکال پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت وہی اشکال ہے جس کی بنیاد پر خوارج میں سے بعض فرقوں نے بہت پہلے ہی اجماع امت کی مخالفت کرکے نصبِ امام کے واجب ہونے سے انکار کیا تھا، خوارج کی اُس دلیل اور اس معاصر استدلال کے درمیان اگر کچھ فرق ہے تو یہی کہ خوارج کی وہ پرانی دلیل، اس جدید اشکال واستدلال کی بنسبت زیادہ دقت و دیانت پر مبنی ہے کیونکہ اس قدیم دلیل میں صرف حدود وقصاص وغیرہ واجبات ہی کو مدنظر نہیں رکھا گیا جو قیام خلافت کے بعد متوجہ ہوتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عدل وانصاف کے قیام کو بھی ایک واجب قرار دیا گیا لیکن ان تمام باتوں کو ضروری خیال کرنے کے باوجود اس کے لئے خاص خلافت کے قیام کو غیر ضروری قرار دیا۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ ان خوارج کا قول نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"وقد شذ بعض الناس فقال بعدم وجوب نصب الخليفة رأسًا لا بالعقل ولا بالشرع، منهم الأصم من المعتزلة وبعض الخوارج وغيرهم. والواجب عند هؤلاء إنما هو إمضاء أحكام الشرع فإذا تواطأت الأمة على العدل وتنفيذ أحكام الله تعالى لم تحتج إلى إمام ولا يجب نصبه.."[۱۲]

حاصلِ ترجمہ: "بعض لوگوں نے امام کے مقرر یہ قول کیا ہے کہ خلیفہ کرنا سرے سے ضروری نہیں ہے نہ عقلا اور نہ شرعا۔ ان میں معتزلہ میں سے اصم اور بعض خوارج شامل ہیں۔ اور ان لوگوں کے نزدیک شرع کے احکام کو جاری کرنا ضروری ہے تو جب امت عدل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے پر متفق ہو جائیں تو امام کا مقرر کرنا ضروری نہیں ہے۔ اور ان کے خلاف اجماع دلیل ہے اور اس قول کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہوں کے ناجائز حرکات سے چھٹکارا حاصل کیا جائے"۔

اس کو حسنِ اتفاق کہئے یا پرانے ماہرین کے نئے جال سے تعبیر کریں لیکن تجربہ یہ ہے کہ اتفاقی نوعیت کے مسائل واحکام میں کتر وبیونت کے لئے جس قدر دلائل واشکالات کے انبار لگائے جاتے ہیں، عام طور پر ان دلائل کا کوئی نہ کوئی سرا ان مباحث ودلائل سے جاملتا ہے جو مختلف فرقوں اور تاریک فتنوں کی حامل جماعتوں کے حوالہ سے ہماری دینی کتب کے ذخیرہ میں موجود ہیں جن کو ایک بار امت کی اجتماعی ضمیر رد کرچکی ہے اور جن کی بدولت امت ایک بار افتراق وانتشار کا مزہ چکھ چکی ہوتی ہے لیکن، کوئی چاہے تو اس کو زاویہ فکر ونگاہ کی تبدیلی کہے یا مزاج ومذاق ڈالا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس بے چاری ومظلوم امت مسلمہ کو خلافت وسیادت کی عزت ومقام سے بہرہ ور فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

---

[۱۲] تاریخ ابن خلدون ،الفصل السادس والعشرون، ج ۱ص ۲۳۹

جمہوریت کے متعلق معتدل موقف

جمہوریت اور موجودہ مسلم دنیا

جمہوریت کے حوالے سے اس وقت مسلم دنیامیں بنیادی طور پر تین موقف ہیں:

۱۔جمہوریت کانظامِ اسلام سے کوئی تضاد و ٹکراؤنہیں ہے۔پارلیمنٹ اسلامی مجلس شوریٰ کی ایک شکل ہے۔جمہوریت خلافت کی متبادل ہے۔

۲۔جمہوریت نظام کفرہے،اس کی تجویز و تائید بھی کفرہے۔اس کو کسی صورت برداشت نہیں کیاجاسکتا۔

۳۔جمہوریت اسلامی نظام حکومت نہیں ہے بلکہ کئی بنیادی امور میں اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے البتہ ہر حال میں کفر بھی نہیں ہے گو بعض

اصول پر عمل کر کے کوئی مناسب طریق کار اختیار کرلیناضروری ہے۔ہمارے نزدیک یہی تیسراموقف حق بجانب ہے اور پہلے دونوں موقف میں کچھ نہ کچھ افراط و تفریط ہے۔

اب ہر موقف کے بنیادی دلائل ذکر کئے جاتے ہیں اور ساتھ ان کا مختصر جائزہ لیاجاتا ہے۔

پہلے موقف کے بنیادی دلائل اوران کاجائزہ

۱۔جمہوریت کوئی مستقل نظم یا فلسفہ نہیں ہے بلکہ محض طرزِ انتخاب ہے اور طرزِ انتخاب کے لئے شرعاًکوئی خاص طریقہ ضروری نہیں ہے اس لئے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

جائزہ:اس کامنشاجمہوریت کی حقیقت و مفہوم سے ناواقفیت ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت اپنے اصل معنیٰ ومفہوم کے لحاظ صرف طرز انتخاب کانام نہیں ہے کہ بس صرف حکمران کا انتخاب کر کے جمہوریت کا تقاضا پورا ہو گیااور اب جمہوریت کے لئے مزید کسی کد وکاش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔بلکہ پورانظام مملکت اور کارِسیاست اس کے مطابق ڈالناضروری ہے تب ہی جاکر اس کو حقیقی معنیٰ میں جمہوریت قرار دیاجاسکتا ہے،لہٰذا یہ مقدمہ کہ:"جمہوریت محض ایک طرزِ انتخاب ہی ہے"ناقابلِ تسلیم ہے۔

دوسری دلیل:

جمہوریت کی ضد آمریت ہے اور آمریت چونکہ اسلام کی نظر میں مذموم ہے اس لئے جمہوریت ہی متعین ہے۔

جائزہ:استقراء تام نہیں ہے۔جمہوریت اور آمریت کے علاوہ اسلام کاایک اور مستقل نظام مملکت ہے جس کو خلافت سے تعبیر کیاجاتا ہے۔وہ نہ پورے طور پر آمریت ہے نہ ہی جمہوریت سے اس کاکوئی معتدبہ رشتہ ہے اور وہی نظام شرعاًمطلوب ہے۔

تیسری دلیل:

جمہوریت بڑے فوائد کاذریعہ ہے،اس سے معاشرہ میں سیاسی بصیرت،رواداری،ہوش مندی وغیرہ اچھے اخلاق وعادات جنم لیتے ہیں۔

جائزہ:اوّلاً تو یہی بات تسلیم نہیں ہے کہ جمہوریت کاان صفات کے پیداہو جانے میں کوئی مثبت کردار ہے بلکہ تجربہ سے عیاں ہوتا ہے کہ جمہوریت ان اور ان جیسے دیگر بہت سے اچھی صفات وعادات کی راہ میں رکاوٹ بن کر اس کی متضاد خامیوں کا سبب بنتا ہے۔لیکن جمہوریت کے ماتھے پر ان فوائد کو چسپاں بھی کر دیاجائے تو بھی یہ کوئی شرعی ضابطہ نہیں ہے کہ جس ذریعے سے ایسی صفات پیداہوتی ہوں وہ ضرور جائز بھی ہو، بلکہ کسی چیز کاجائز ہونایاممنوع ہوناشرعی دلائل پر موقوف ہوتاہے اور شرعی دلائل ہی کی روشنی میں کسی چیز کے متعلق یہ فیصلہ کیاجاسکتاہے کہ وہ جائزہے یاممنوع؟اس لئے یہ دلیل مخدوش ہے۔

دوسرے موقف کے دلائل اوران کاجائزہ

دوسرے موقف کاحاصل یہ تھا کہ جمہوریت نظام کفرہے جس کو کسی صورت میں برداشت نہیں کیاجاسکتا۔

جائزہ:اس میں درج ذیل باتوں کے تنقیح کی ضرورت ہے اس کے بعد ہی بات صاف ہوسکتی ہے:

جمہوریت اگر کفر ہے تو اس میں مناطِ کفر کیا ہے؟ اور پھر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جمہوریت کے موجود ہونے کے لئے وہ مناط بہر حال ضروری ہے کہ اس کے بغیر جمہوریت کا تصور مکمل نہیں ہوتا؟ یا کسی ایسی بات کو موجب کفر قرار ریاجارہاہے جو جمہوریت میں بعض اوقات پیش آتی ہے لیکن اس کے ضروری جزء کی حیثیت نہیں رکھتی؟

مناطِ کفر اور اس کا جائزہ

اس موقف کے اکثر حاملین کے نزدیک مناط کفر یہ ہے کہ جمہوریت میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی بلکہ پارلیمنٹ کے اراکین بھی قانون سازی کرسکتے ہیں اور وہ اس سلسلہ میں مکمل خود مختار ہوتے ہیں کہ آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے کوئی بھی قانون بنانا چاہے تو بناسکتے ہیں خواہ قرآن وسنت کے مطابق ہو یا اس کے خلاف۔

جائزہ: اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جمہوریت کی بڑی اور بنیادی خامی یہی ہے اور اس میں بھی کوئی اشتباہ نہیں ہے کہ موجودہ دور میں جن جگہوں پر جمہوری نظام قائم ہے وہاں اکثر جگہوں میں کلی یا جزوی طور پر یہ خرابی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے بجا طور پر یہ اشکال عائد ہوجاتا ہے اور یہ جمہوریت یعنی "ڈیموکریسی" کا اصل ابتدائی تصور اور وجہ تسمیہ بھی ہے۔[۱۳]

لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جمہوریت ایک لچک دار نظام ہے، ضروری نہیں ہے کہ ہر جگہ جمہوریت میں اسی خرابی کے عنصر کو برقرار رکھا جائے بلکہ نظریاتی دنیا میں ایسی جمہوریت کا تصور ناممکن نہیں ہے جہاں عوام یا ان کے منتخب نمائندوں کو حاکمیت کا اختیار نہ دیا گیا ہو اور وہ قرآن وسنت کے احکام کے برخلاف کوئی قانون وحکم نہ منظور کراسکتے ہوں بلکہ ان کا اختیار یا حاکمیت انتظامی قوانین کی حد تک محدود ومنحصر ہو۔ چنانچہ ہمارے ملک پاکستان کا آئین جب تیار ہورہا تھا تو اس وقت کے اہل علم کو یہی فکر دامن گیر تھی اور اسی فکرمندی کے نتیجے میں انہوں نے یہاں کی رائج جمہوریت میں کم از کم نظریاتی طور پر یہ شق شامل کرنا چاہا تھا کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہوگی اور قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون منظور نہیں ہوگا اور کم از کم کاغذی کاروائی کی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوگئے۔

اس تناظر میں سوال یہ کھڑا ہوتا ہے کہ اگر کہیں نظریاتی اور عملی دونوں سطح پر ایسے نظام کو رائج کیا جائے اور بدقسمتی سے اس کو جمہوریت ہی کا نام دیا جائے تو کیا پھر بھی محض اس بنیاد پر اس کو نظام کفر تصور کیا جائے گا کہ اس کا نام جمہوریت ہے! ظاہر ہے کہ شرعی احکام اور خصوصاً کفر واسلام کے نازک فیصلوں کا مدار اسماء والقاب پر نہیں ہوتا بلکہ حقائق ومعانی پر ہوتا ہے اس لئے ایسی صورت میں جب مناط کفر موجود نہیں ہے تو اس کو کفر قرار دینا درست نہیں ہے۔ مکرر واضح رہے کہ کفر نہ ہونے کا مطلب اس کی اجازت دینا نہیں ہے بلکہ کسی چیز کے کفر نہ ہونے اور جائز ہونے کے درمیان دیگر مراحل بھی ہیں جس کی تفصیل اسی مضمون کے آخر میں ان شاء اللہ عرض کردی جائے گی۔

جہاں تک اس موقف کے دوسرے نکتے کا تعلق ہے کہ اس نظام کو کسی صورت برداشت نہیں کیا جاسکتا، تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ واقعۃً جو چیز منکر ہو اس کو جہاں تک ہوسکے بالکل برداشت نہیں کرلینا چاہئے، لیکن اس کے لئے کچھ شرائط وضوابط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو تیسرے موقف کے ذیل میں مختصراً ذکر کردی جائے گی ان شاء اللہ۔

تیسرا موقف اور اس کے دلائل

دلیل: دنیائے انسانیت میں رائج جمہوریت صرف طرزِ انتخاب ہی نہیں ہے کہ ووٹوں کے ذریعے چند نمائندوں کو منتخب کیا جائے اور پھر اس کے بعد ان کی مرضی ہو جس طرح نظام چلانا چاہے، چلاسکتے ہوں بلکہ انتخابات کے مرحلے بعد سیاست، امارت وغیرہ جملہ مراحل میں جمہوری نظم اور اس کے تقاضوں کو بروئے کار رکھنا ضروری ہے۔ اگر کچھ عناصر عملی طور پر نظام کو اپنے کنٹرول میں بھی لے لیں تو بھی کم از کم قانون

---

[۱۳] حضرت مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ کے بیانات وانٹرویوز پر مشتمل مفید کتاب "آذان سحر" ص۱۱۹" میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو قانون سازی کا ایسا غیر محدود اختیار دینے کو حاکمیت میں شرک قرار دیا گیا ہے۔ ارباب ذوق اس کی طرف مراجعت فرمائیں۔

و نظریے کی حد تک جمہوری ڈھانچے کو بر قرار رکھنے کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے جمہوریت میں عوامی اقتدار اور ان کے منشا کے مطابق کسی چیز کو قانون کا درجہ دینا گویا ایک ضروری جزء کی حیثیت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس معنیٰ میں جو جمہوریت ہو گی، وہ اسلامی نظم سے متصادم ہی ہو گی بلکہ عملی طور پر اگر ایسی جمہوریت کا جائزہ لیا جائے تو قدم قدم پر شرعی احکام و حدود سے تضاد ہی نظر آئے گا۔

جہاں تک اس موقف کا دوسرا جزء ہے کہ مسلمانوں کے جن آبادیوں میں یہ نظام پہلے سے قائم چلا آرہا ہے وہاں اس وقت تک اس کو "

عبوری طور پر اس نظام میں دفاعِ دین کی ہر ممکنہ کوشش کر لینی چاہئے اور ساتھ موقع و محل کے مطابق اور اپنی قدرت واستطاعت کی حد تک نظریاتی و عملی سطح پر اصل ہدف کی بھر پور تیاری بھی کر لینی چاہئے کہ کوئی مثالی اسلامی فلاحی ریاست قائم ہو۔ مطلوبہ استعداد و تیاری متحقق ہونے سے پہلے عملی طور پر اگر رائج نظام سے تصادم بر تا جائے تو اس کے جو کچھ نتائج بر آمد ہوں گے اس کے تصور سے بھی انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور شرعاً مامور بہ بھی نہیں ہیں۔ یہ کوئی تخیّلاتی طلسم نہیں ہے بلکہ ماضی و حال کے بیسیوں تجربات اس کے شاہد عدل ہیں۔

لیکن جس طرح مطلوبہ استعداد مہیا ہو جانے سے پہلے نظام سے بغاوت مذموم و پُر خطر ہے یوں ہی ایک قابل افسوس پہلو یہ بھی ہے کہ جو لوگ عملی طور پر اس نظم میں لگ جاتے ہیں وہ رفتہ رفتہ اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ان کے ذہن واعتقاد سے اصل حقیقت اور اس کا واقعی پسِ منظر غائب ہو جاتا ہے چنانچہ پھر وہ اس بات کے لئے نظریاتی طور پر تیار نہیں ہوتے کہ جمہوریت میں اسلام کے خلاف کوئی پہلو بھی ہے یا نہیں؟ اور اس کے علاوہ اسلام کا کوئی نظام مملکت مطلوب بھی ہے یا نہیں؟ اور جب یہ چیز دل و دماغ کے افق سے غروب ہو جاتی ہے تو اس کے بعد دسیوں شرعی و عملی خامیاں جنم لینے لگتی ہیں جس سے ایک بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ مطلوبہ نظام تک پہنچنے کی کوئی تیاری نہیں کی جاتی بلکہ اس کو گوارا کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے اور ان خامیوں کی جڑیں چونکہ نظریات کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اس لئے عملی طور پر پورے اخلاص، جذبہ اور دین داری کے باوجود یہ ساتھ نہیں چھوڑتیں بلکہ چولی دامن کا ساتھ ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ وہی اعتقادی و نظریاتی ناپختگی ہے اور نئی نسل میں اس کا تذکرہ نہ کرنا ہے۔ اس لئے اس " نظریاتی گمراہی " سے بچاؤ کی تدبیر کرنا نہایت ضروری ہے۔

تقسیم جمہوریت

جمہوریت کی خرابیوں اور اسلام متصادم مزاج سے بچنے کے لئے وطن عزیز پاکستان وغیرہ میں اسلامی جمہوریہ کی اصطلاح شروع ہوئی اور جمہوریت کو دو قسموں میں بانٹ دیا گیا، ایک کو اسلامی جمہوریت اور دوسرے کو غیر اسلامی یا مغربی جمہوریت کے عنوان سے موسوم کر دیا گیا۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا جمہوریت میں ایسی تقسیم ممکن ہے؟ اور اسلام کا جمہوریت کے ساتھ اتفاق آسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں اربابِ فکر و نظر کی آراء متعدد ہیں۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک ایسا کرنا بالکل ممکن بلکہ واقع ہے اس موقف کی ترجمانی قدرے تفصیل کے ساتھ حضرت مولانا اسحاق باجوڑی صاحب زید مجدہم نے اپنی کتاب "اسلام اور جمہوریت " میں کی ہے۔ جبکہ اس کے بالمقابل کئی ارباب فکر نے سختی کے ساتھ اس تقسیم کی تردید فرمائی ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ جمہوریت اور اسلام میں کوئی مصالحت ممکن نہیں ہے، اس موقف کی ترجمانی حضرت مولانا عاصم عمر صاحب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "ادیان کی جنگ " میں کی ہے۔ بر صغیر پاک وہند کی طرح عرب اسلامی دنیا میں بھی ارباب فکر و دانش کا موقف ایک نہیں ہے بلکہ دونوں موقف موجود ہیں بلکہ یہاں کی بنسبت وہاں زیادہ اس مسئلہ کو زیر بحث بنایا گیا ہے اور اس پر متعدد کتابیں و مقالات بھی تحریر کئے گئے ہیں۔

معتدل موقف

اس باب میں بار بار غور و فکر کرنے کے بعد جس بات کو ہم نقطہ اعتدال سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اگر اسلام اور جمہوریت دونوں کے اصل تصور و مقصود کو دیکھا جائے اور دونوں کو اپنی اصلی حالت میں لے کر موازنہ کیا جائے تو واقعۃً دونوں میں اس حد تک تضاد و تصادم ہے کہ یکجا جمع ہونا ممکن نہیں ہے، دونوں میں مصالحت تبھی ممکن ہے کہ یا جمہوریت کا مفہوم بگاڑ کر اس کو اسلام کے زیر نگین کر دیا جائے اور بس نام کی جمہوریت رہ

جائے اور یا اسلام کا حلیہ بدل بدل کر جمہوریت کے سانچے میں ڈالا جائے اور صرف نام کا محدود اسلام رہ جائے۔ اب اگر کوئی شخص ان آخری دونوں صورتوں میں کوئی صورت اختیار کر کے دونوں نظاموں میں جمع و تطبیق کی کوشش کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر جمہوریت کے مفہوم اوراس کے تقاضوں میں اسلامی احکام وتعلیمات کے مطابق ترمیم وتبدیلی کی جائے اور اس کو اسلامی جمہوریت کا لباس پہنایا جائے تو بالکل ممکن ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ دونوں نظاموں میں صلح ممکن ہوئی بلکہ یہ اصلاً اسلامی نظام ہے صرف نام کی جمہوریت ہے اور اس کا برعکس کیا جائے تو وہ خالص جمہوری نظام قرار دیا جائے گا صرف نام کی حد اسلامی نظام ہو گا۔ [۱۴]

نکات اختلاف

اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت وریاست کے متعلق اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ:

الف: یہ اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے کا ایک وسیلہ ہے اور انسان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلیفہ ونائب کی ہے۔

ب: اس کا کام بلکہ ذمہ داری یہی ہوتی ہے کہ جس شخص کی خلافت ونیابت انجام دے رہا ہے اس کے احکام وتعلیمات کو نافذ کرنے کی بھرپور کوشش کرتا رہے۔

ج: اگر اس کے اختیارات کو دیکھا جائے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ نائب کا اختیار حد درجے محدود ہے، اس کو اتنی آزادی حاصل نہیں ہوتی کہ چاہے تو خدا تعالیٰ کے حکم کو معطل چھوڑ دے یا اس کے خلاف کوئی دوسرا حکم نافذ کرے۔ اسی طرح وہ خدا تعالیٰ کے حکم کے خلاف نہ اپنی پسند وناپسند یا علم وتحقیق پر عمل کر سکتا ہے نہ ہی کسی دوسرے شخص کی غلامی کا طوق گلے میں پہن سکتا ہے۔

جبکہ جمہوریت کا تصور ان تمام مقدمات میں اسلام کے تصور سے سراسر مختلف ہے، یہاں قوت کا سرچشمہ عوام ہے۔ انتخاب میں عوام اور قانون سازی میں عوامی نمائندے مکمل طور پر آزاد ہوتے ہیں جس چیز کو قانونی یا غیر قانونی ہونے کا درجہ دینا چاہیں، اس کی تجویز دے سکتے ہیں اور قانون وہی بنے گا جس پر ان نمائندوں کی غالب اکثریت کا اتفاق ہو گا۔ قرآن وسنت کی پابندی یہاں کوئی ضروری نہیں ہے بلکہ ایسی کسی غیر عوامی قانون کی پابندی نہ کرنا ہی کسی صحیح اور ٹھیٹھ جمہوریت کے لئے ضروری ہے، جمہوریت کے خیال میں یہ بات انسانی حقوق کے خلاف ہے کہ اس کی آزادی کو آئین کے سوا اور کسی چیز کا پابند قرار دیا جائے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اور جمہوریت کے اصل فکر وفلسفے کو دیکھا جائے تو دونوں میں مصالحت ممکن نہیں ہے۔ دونوں کو اسی صورت میں جمع کیا جا سکتا ہے کہ کسی ایک میں تبدیلی لا لا کر دوسرے کے مزاج ومذاق کے مطابق بنایا جائے۔ اب اگر جمہوریت کے فکر وفلسفے اور اس کے مفہوم وتقاضوں کو نکیل ڈال کر اسلام کے زیر انتظام کر دیا جائے تو ایسا ممکن ہے، البتہ اس میں بھی درج ذیل نکات واضح رہنی چاہئے:

۱۔ جمہوریت خالص مغربی فکر وفلسفے کا پیداوار اور اسی کا آئینہ دار ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو ایسے مشتبہ لفظ کے استعمال

---

[۱۴] ایک دوست کے توجہ دلانے پر ہمیں حضرت مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ کا درج ذیل موقف ملا جس سے ہمارے اس موقف کی پوری تائید ہوتی ہے، آپ رحمہ اللہ انٹرویو کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: "اگر کوئی شخص مارکس اور لینن کے نظریے کو اسلامی سوشلزم سے تعبیر کرتا ہے تو وہ اسلامی تعلیمات کی تکذیب کرتا ہے اور وہ اسلامی مساوات اور اسلام کے معاشی نظام کو اسلامی سوشلزم کا نام دیتا ہے تو یہ شخص کافر تو قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ تعبیر کی غلطی کا شکار ضرور ہے کیونکہ اسلام تعبیرت اور اصطلاحات میں بھی خود کفیل ہے اور وہ کسی غیر ملکی اصطلاح کا محتاج نہیں ہے۔" (اذان سحر، ص ۳۲)

اسی طرح بعد میں شیخ الحدیث حضرت مولانا نور محمد شہید صاحب رحمہ اللہ کی مفید ومفصل کتاب "جمہوریت عقل ونقل کے آئینہ میں" دیکھنے کی توفیق نصیب ہوئی تو اس کا حاصل بھی تقریباً وہی ہے جو اس مضمون میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر کافی مفید واہم دستاویز ہے جس میں فاضل مؤلف رحمہ اللہ نے اپنے روایتی مزاج ومذاق کے مطابق بڑے بسط وتفصیل کے ساتھ "جمہوریت" کے متعلق تقریباً ہر پہلو سے گفتگو فرمائی ہے اور اس سلسلے میں اپنے پختہ علمی استعداد اور ٹھوس نقد واستدلال کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ کاش کوئی صاحبِ علم اس کتاب کی کماحقہ خدمت کر کے شائع کریں۔

کرنے سے گریز کرلینا چاہئے خصوصاً اس کے ساتھ اسلام کا لاحقہ لگانے سے احتراز ہی کرنا ضروری ہے۔ یہ دین اسلام کا ضابطہ ہے جس پر بیسوں مسائل متفرع ہوتے ہیں اور اس ضابطے کی اصل قرآن کریم کی درج ذیل آیت کریمہ ہے:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ} [البقرة: ١٠٤]

۲۔ اس نسبت کو اسی وقت بادل نخواستہ گوارا کرلیا جاسکتا ہے جبکہ مجوزہ نظام واقعۃً ایسا ہو جس کے مقاصد واہداف اور اس کے حاصل کرنے کے طریقہ کار میں اسلامی تعلیمات کے خلاف کوئی شق موجود نہ رہے۔ شریعتِ اسلامیہ اس بات کی روادار نہیں ہے کہ کچھ حصہ اس کا ہو اور کچھ حصہ اس سے متصادم کسی نظام سے لیا جائے اور دونوں میں صلح و تطبیق دیکر کوئی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے اور پھر اس کو اسلام کا نام دیا جائے۔ لہٰذا اگر مجوزہ نظام کے مقاصد یا اس کے طریق کار میں اسلامی احکام سے متصادم کوئی شق شامل ہو تو اس مجموعی نظام کو اسلامی کہلوانا کسی طرح درست نہیں ہوگا۔

یہ تو اس مسئلے کا نظریاتی پہلو تھا[15]۔ جہاں تک عملی دنیا میں دیکھا گیا تو اپنی محدود معلومات کے مطابق پوری صدی گزرنے کے باوجود ایسی کوئی اسلامی جمہوریت ہمیں نظر نہیں آتی جو نظریاتی طور پر درست ہونے کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی کامیاب ہو اور صحیح سمت میں روبہ سفر ہو۔ اس کے وجوہات واسباب کیا ہیں؟ اور مسلمانوں کی چاہت و قربانیوں کے باوجود ایسا کوئی نظام کیوں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتا؟ اور کچھ ہی دیر چلنے کے بعد کیوں اس کا کجاوہ مغربی جمہوریت کی طرف جھک جاتا ہے اور پورا نظام اسی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے؟ یہ وہ نکات و سوالات ہیں جس پر ارباب علم وفکر اور اصحاب علم ودانش کو خوب غور وخوض کرلینا چاہئے تاکہ کمزوری کی بنیاد معلوم ہوسکے اور نشانِ منزل کا تعین کیا جاسکے!

یہ چند بے ربط سطور تھے جو جمہوریت کے متعلق راقم کے فکر ومطالعے کا نچوڑ ہے۔ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ تمام باتوں کو اختصار وایجاز کے ساتھ منطقی طرز استدلال میں ذکر کیا جائے اور ساتھ سہولت وروانی برقرار رکھنے کی بھی کمزور کوشش کی گئی ہے۔ منطقی طرز استدلال کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری جلدی کلام کے مغز ومقصود تک پہنچ جاتا ہے اور دعویٰ کی بنیاد تک سہولت کے ساتھ رسائی ممکن ہو جاتی ہے جس کے بعد اس بات کا جانچ وپڑتال کرنا آسان ہو جاتا ہے اور یوں راقم وقاری کا بڑا وقت بچ جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی صاحب اس بات کو آگے بڑھانا چاہے تو اسی انداز کو برقرار رکھنے کی کوشش فرمائیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

بندہ عبید الرحمٰن

۲۹ جمادی الاولیٰ ۴۲ھ

☆☆☆☆☆☆☆

[15] اس نظریاتی پہلو کی حیثیت "دلیل لمی" کی بھی ہوسکتی ہے کہ اسلام اور جمہوریت کے اساس ومقتضیات میں اس طرح تضاد ہے جس کے ہوتے ہوئے دونوں کا بیک وقت جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔ "دلیل انی" وہ تجربات ہیں جو پوری صدی امت مرحومہ کے مختلف اطراف واکناف میں آزمائے گئے۔